اکائی 4 غالب کا شعری اسلوب

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد
4.2 تمہید
4.3 اسلوب کیا ہے؟
4.4 غالب کا فن اور شخصیت
4.5 غالب کا شعری اسلوب
4.6 متن اور اس کی تشریح
4.7 آپ نے کیا سیکھا
4.8 اپنا امتحان خود لیجیے
4.9 سوالات کے جوابات
4.10 فرہنگ
4.11 کتب برائے مطالعہ

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اسلوب کی تعریف اور اہمیت سے واقف ہوں گے
- غالب کے حالات زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے
- غالب کے کلام کی خصوصیات سے واقف ہوں گے
- غالب کے ہم عصر شعراء سے واقف ہوں گے
- غالب کے نمائندہ کلام کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے

4.2 تمہید

غالب ہمارے ادبی سرمایے کا اہم نام ہے۔ چاہے بات نثر کی ہو یا شاعری کی۔ غالب سے ہماری ملاقات اردو ادب کے ایک اہم تہذیبی و تاریخی موڑ پر ہوتی ہے۔ ایسا موڑ جہاں اور شعر ونثر فارسی تہذیب وثقافت سے ہاتھ چھڑا کر اردو، ہندی یا ہندوستانی تہذیب کا دامن تھام رہے تھے۔ غالب کی عظمت یہی ہے کہ تاریخ کے اس موڑ پر غالب نے اپنی انفرادیت اور اپنے اسلوب کی مدد سے

اردو شعر و نثر کو ایک نیا وقار اور بلندی عطا کی۔ غالب کا شعری اسلوب اردو کے دیگر شعراء سے مختلف و منفرد ہے۔ اپنے لب ولہجہ اور انداز بیان کی بناء پر غالب کا شعر سینکڑوں اشعار میں صاف پہچانا جاسکتا ہے۔ غالب کے اس منفرد شعری اسلوب کی تشکیل میں تجربہ و مشاہدہ کی قوت، اس کے حالات زندگی اور زبان کا خلاقانہ استعمال اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے غالب فکر وفن، حالات زندگی اور شاعرانہ خصوصیات کا مطالعہ اردو ادب کے طالب علموں کے لیے ہمیشہ ہی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

4.3 اسلوب کیا ہے؟

اسلوب کو عام الفاظ میں طرز تحریر یا طرز نگارش کہا جاتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں اسٹائل اور فارسی میں سبک بھی کہا جاتا ہے۔ ادب کی ہر صنف میں ادائی مطلب یا خیالات و جذبات کا ایک طریقہ یا اصول رائج ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر صنف کے کچھ اجزائے ترکیبی بھی ہوتے ہیں۔ انہی اصول وضوابط کی روشنی میں ہر شاعر یا ادیب اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ ساتھ ہی ہر شاعر یا ادیب کی کچھ انفرادی خصوصیات بھی ہوتی ہیں۔ یہ انفرادیت دراصل اس شاعر یا ادیب کے علم، تجربے، مشاہدے، طرز زندگی اور طرز فکر سے تشکیل پاتی ہے۔ ان ہی کا عکس اس کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض فن کار زبان و بیان کے حوالے سے بھی اپنی انفرادیت کا احساس دلاتے ہیں۔ طرز تحریر یا طرز نگارش کی انہی خصوصیات کو کسی ادیب یا شاعر کا اسلوب کہا جاتا ہے۔ جب کبھی ہمیں کوئی شعر سنا کر شاعر کی شناخت کے لیے کہا جاتا ہے اور ہم شاعر کی صحیح شناخت کر پاتے ہیں تو یہ دراصل شاعر کے اسلوب کی بناء پر ہوتا ہے۔ اسلوب ہی ہے جو شاعر اور اس کے کلام کو انفرادیت بخشتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلوب ایک ایسا انداز بیان، طرز اظہار یا طرز ادا ہے جو دل نشین بھی ہو اور منفرد بھی۔

4.4 غالب کا فن اور شخصیت

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے عبداللہ بیگ خاں کے گھر اکبر آباد (آگرہ) میں آنکھ کھولی جو فوج میں ملازم تھے۔ پانچ برس کی چھوٹی عمر میں یتیم ہوئے۔ تو چچا نصر اللہ بیگ خاں نے پرورش کا ذمہ اٹھایا۔ شومئی قسمت کہ نو برس کی عمر میں چچا کا انتقال ہوگیا۔ غالب پھر ایک بار بے سہارا ہوگئے۔ ۱۳؍ برس کی عمر میں خاندان لوہارو سے تعلق رکھنے والے الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے شادی ہوگئی اور چودہ برس کی عمر میں غالب دہلی پہنچے۔ غالب کے اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں دہلی میں شاہ عالم، لکھنو کے نواب آصف الدولہ، حیدرآباد کے نواب نظام علی خان اور الور کے راجہ بختاور سنگھ کے ہاں رسالدار کے طور پر ملازم رہے۔ خود ان کے چچا نصر اللہ بیگ

خاں اکبر آباد کے کے صوبہ دار تھے لیکن غالب نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ غالب خداداد صلاحیتوں کے مالک اور بلا کے جدت پسند تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حصول علم کے لئے کسی مکتب میں رسمی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن زبان و بیان پر قدرت، فکر کی بلند پروازی، معنی آفرینی، تخیل کی ندرت اور نئی نئی تراکیب کا استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب نابغۂ روزگار شاعر ہے۔

غالب کی شاعری میں تصوف کے مضامین بھی جابجا پائے جاتے ہیں۔ تصوف غالب کے عہد کا ایک غالب رجحان رہا ہے لیکن غالب کا انداز دیگر شعراء سے بے حد مختلف و منفرد نظر آتا ہے۔ غالب کے لئے تصوف ایک مسلک نہیں بلکہ ایک روحانی تجربہ ہے اور غالب اس تجربے میں شریک ہوتے ہیں اسی لئے ان کے اشعار میں غالب کی ذات کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ درج ذیل شعر میں ایک ایسا ہی عام فہم مضمون بیان کیا گیا ہے جو خدا کی ذات وصفات سے متعلق ہے لیکن دوسرے مصرعے میں ہمیں شاعر کی ذات کی موجودگی محسوس ہوتی ہے اور ہم بھی غالب کے تجربے میں برابر کے شریک ہوجاتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا نہ ہوتا کچھ تو خدا ہوتا
ڈبو یا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ہلکا سا طنزیا شوخی ایک زیریں لہر موجود ہے۔ یہ شوخی بھی غالب کے مزاج کا حصہ ہے۔ غالب نے زندگی کے دشوار مراحل کو جس طرح ہنستے کھیلتے جھیلا ہے اس کا عکس ان کی شاعری میں بھی صاف جھلکتا ہے۔ یہ دراصل غالب کی زندہ دلی ہے جو اشعار میں بھی راہ پالیتی ہے۔ کسی شاعر کی شخصیت کا عکس ہی اس کے اشعار کو دوسروں سے مختلف و منفرد کرتا ہے اور اسی کو ہم کسی شاعر کا شعری اسلوب قرار دیتے ہیں۔ غالب کی شوخی کے چند نمونے دیکھتے ہیں۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھاکے بے مزہ نہ ہوا

عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے فن اور شخصیت میں بے یکسانیت تھی۔ غالب نے حالات و حوادث زندگی کا مقابلہ زندہ دلی سے کیا۔ اپنے وقت کے رائج علوم کا مطالعہ عرق ریزی سے کیا۔

اپنے متاخرین کے کلام کا مطالعہ باریک بینی سے کیا اوران سب کی روشنی میں اپنی الگ راہ نکالی۔ غالب کے لہجے اور شعری اسلوب کی تشکیل میں ان کی شخصیت کا کردار اہم رہا ہے۔ غالب کے معاصرین کے تذکرے کے بغیر ان کے فن وشخصیت کا جائزہ ادھورا رہے گا۔ غالب کے عہد میں انہیں معاصرین بھی ہم پلہ ملے۔ جن میں سب سے اہم محمد ابراہیم ذوق ہیں جن سے غالب کی معاصرانہ چشمک مشہور ہے۔ مومن خان مومن بھی عہد غالب کے ایک صاحب طرز شاعر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اہم معاصرین میں مفتی صدرالدین آزردہ، میر مہدی مجروح، شیفتہ، ہرگوپال تفتہ اور حالی اہم ہیں۔ حالی کو غالب کی محبتیں بھی نصیب ہوئیں اور یادگار غالب کی شکل میں حالی نے غالب کی سوانح رقم کر کے اردوادب عالیہ میں اہم اضافہ کیا۔ سرسید بھی غالب کے ہم عصر ہیں۔ جن کی کتاب آثار الصنادید کا دیباچہ انہوں نے غالب سے لکھوایا تھا۔ اسی دیباچے میں غالب نے سرسید کو ''مردہ پروردن مبارک کار نیست'' کا مشورہ دیا۔ غالب کے اسی مشورے نے سرسید کی فکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

4.5 غالب کا شعری اسلوب

غالب کے کلام کی اصل خوبی اس کی جدت اور انوکھا پن ہے۔ غالب ایک ذہین فن کار ہے۔ وہ اپنی طرز نگارش کو شعوری طور پر اپنے متاخرین ومتقدین سے جداگانہ اور منفرد رکھنے پر قادر ہے۔ وہ سامنے کی بات کو بھی اپنے خاص رنگ اور مزاج میں کہتے ہیں۔ ان کا ہر جذبہ، ہر تاثیر اور خیال دلکش ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنے شعری اسلوب کی تشکیل میں غالب الفاظ وتراکیب اور تشبیہات واستعارات بہت سوچ سمجھ کر اور عام ڈگر سے ہٹ کر استعمال کرتے ہیں۔ غالب نے اردو غزل کو بے شمار نئے مضامین سے مالا مال کیا۔ حسن وعشق کے موضوعات میں جہاں سنجیدگی ومتانت کا استعمال کیا وہیں شوخی وظرافت کے بھی بے مثال نمونے پیش کیے۔ فارسی کے قدیم شعراء کے ہاں موجود بے شمار مضامین کو اپنے جدید اور انوکھے انداز میں اس طرح ڈھالا کہ وہ مستعار مضامین نہیں لگتے ہیں۔ رعایت لفظی اور سہل ممتنع استعمال کرتے ہوئے غالب عام مضامین کو بھی خیال آفرینی کے عروج پر پہنچا دیتے ہیں۔ زبان فارسی پر قدرت اور ہندوستانی تہذیب کے رچاؤ نے غالب کے کلام میں بندش الفاظ اور تراکیب کے استعمال کی ایسی جدت کا نمونہ پیش کیا ہے جس کا تتبع اور تقلید ہر عہد میں کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کا دل ایک عاشق کا دل ہے اور ان کا دماغ ایک فلسفی کا دماغ ہے۔

عاشق کا دل جذبے کی تاثیر میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور فلسفی کا دماغ ہر وقت جدت طبع کے مظاہرے پر اکساتا ہے۔ حسن و عشق غزل کے محبوب و پسندیدہ مضامین رہے ہیں۔ اردو غزل کا عاشق ہمیشہ ہی محبوب کے گرد پھیرے لگاتا نظر آتا تھا لیکن غالب کے ہاں پہلی بار یہ صورت بدلتی ہے اور محبوب کی جلوہ سامانیوں کا قائل ہوتے ہوئے بھی عاشق اپنی شخصیت کا نقش مرتب کرتا نظر آتا ہے ۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

یہ لہجہ اور یہ انداز اردو غزل کے لئے یکسر بنا تھا۔ غالب مضامین کے ساتھ ساتھ انداز بیان اور طرز ادا میں بھی ایک انقلابی تبدیلی کے نقیب تھے۔ جس کے باعث ان کے معاصرین کا ان سے رشک وحسد کرنا بھی واجب تھا۔ سنجیدگی و متانت کے ساتھ ساتھ شوخی و ظرافت بھی غالب کی شخصیت کا حصہ تھے اور اسی لئے ان کے شعری اسلوب میں بھی شوخی و ظرافت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اسی لئے اگر ایک جگہ غالب کی طبیعت عشق سے زیست کا مزا پاتی ہے تو دوسری جانب وہ عشق کو دماغی خلل بھی قرار دیتا ہے۔ غالب کا کمال یہی ہے کہ اسے ہر طرح کے مضامین کی ادائیگی کا سلیقہ اور قدرت بھی حاصل ہے۔ اسے اپنی اس خوبی کا احساس بھی ہے اور وہ اسے خوش طبعی سے بیان کرنے کا ہنر بھی جانتا ہے ۔ملاحظہ فرمائیں ۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

سیدھے سادے اور عام الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتے ہوئے رعایت لفظی کی خوبصورت مثالیں بھی غالب کی شاعری میں خوب ملتی ہیں۔ جہاں اشعار میں کہیں کوئی مشکل لفظ یا ترکیب نہیں ہوتی لیکن خیال اور جذبہ طرز اظہار کی بلندی پر نظر آتے ہیں ۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

غالب کی طرز ادا میں جو شوخ نگاری پائی جاتی ہے وہ ہمیں کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتی ۔ یہ شوخی عام مضامین سے لے کر سنجیدہ بلکہ فلسفیانہ مضامین کی ادائیگی میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے ۔ اسے غالب کے اسلوب کا ایک اہم عنصر مانا جاتا ہے ۔ اس شوخی کا معیار بہت بلند ہوتا ہے ۔ اس میں عشقیہ مضامین بھی شامل ہوتے ہیں اور زندگی کے مسائل بھی ۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب سے قبل اردو غزل حسن و عشق کے مضامین سے بھری پڑی تھی ۔ اس میں حکمت و اخلاق کے مضامین کم کم ہی پائے جاتے تھے ۔ جب بھی غزل میں ایسے مضامین کا بیان کیا گیا غزل کی فضاء بوجھل لگنے لگتی تھی ۔ خود غالب کے بعض معاصرین کے ہاں ایسے حکیمانہ و اخلاقی مضامین ملتے ہیں ۔ لیکن روکھے پھیکے لگتے ہیں ۔ غالب نے ان مضامین کو رمز و ایماء کی زبان میں بیان کیا ہے ۔ اگرچہ کہ اس دوران بعض مضامین پر فلسفیانہ اور ادق ہونے کا گمان ہوتا ہے لیکن غالب کے اسلوب کی لطافت اور طرز ادا کی جدت ایسے اشعار کو بھی مقبول عام اشعار کا درجہ دلاتی ہے ۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
رنج سے خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب کے اسلوب کی خصوصیات میں سے ایک ان کی تشکیک پسندی بھی ہے جو غالب کے کلام میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ تشکیک پسندی دراصل غالب کو اپنے عہد کی دین ہے۔ان کا فلسفیانہ مزاج اس میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ غالب جس عہد میں سانس لے رہے تھے وہاں ایک تہذیب روبہ زوال ہورہی تھی اوراس کی جگہ ایک نئی تہذیب اپنی جڑیں تلاش کررہی تھی۔ غالب روبہ زوال تہذیب کے پروردہ تھےلیکن نئے زمانے کی آہٹ سے بے بہرہ بھی نہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

تصوف غالب کے عہد کا ایک اہم رجحان تھا۔مغرب میں جو درجہ سائنسی علوم کو حاصل تھا مشرق میں تصوف کو وہی درجہ حاصل تھا۔تصوف اردو اور فارسی شعریات میں ایک نئی فضاء اور نئے آسمان سے عبارت تھا۔دہلی کے قدیم معاشرے کے پروردہ غالب اپنی جوانی کے ایام میں سرکار انگلشیہ کے حضور اپنی وراثت کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ پہنچے تھے۔ جہاں انہوں نے سائنس اور صنعتی انقلاب کے جلوؤں کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کیا تھا۔تصوف غالب کو لکیر کا فقیر نہیں بناتا ہے بلکہ مشاہدے کی قوت اور دیدۂ بینا کو بیدار کرنے پر اکساتا ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

قطرے میں دریا دکھائی نہ دے اور جز میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

وا کردیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

غالب اپنے مضامین ہماری روزمرہ کی زندگی سے اٹھاتے ہیں۔ اوران ہی کو مکالمے یا گفتگو کی صورت ہم تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے اشعار کے معنی کے کئی پرتیں ہوتی ہیں اور کئی میں ایک گہرا فلسفہ بھی۔ لیکن یہ اشعار اپنی طرز ادا اور خیال آفرینی کے باعث سامنے کے معنی سے بھی قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غالب اپنے عہد کے نباض بھی ہیں اور ان کی نگاہ اپنے عہد سے آگے بھی دیکھتی ہے۔ وہ قدامت پسند بھی ہیں اور نئے موسموں کے واقف کار بھی۔

5.6 متن اوراس کی تشریح

غزل

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا تیرے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو، خود بیں و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں

بیٹھا ہے بت ، آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلا مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

تشریح :

بازیچہ اطفال ہے .... تماشا مرے آگے

بازیچہ اطفال یعنی بچوں کا کھیل۔ شاعر کی نظروں میں دنیا بچوں کا کھیل ہے۔ بچوں کا کھیل جو عارضی ہوتا ہے، جو ناپائیدار ہوتا ہے اور ختم ہونے والا ہے۔ شاعر کے نزدیک وہ دنیا کی حقیقت کو جان چکا ہے۔ وہ بھی اوروں کی طرح دنیا کو اہم تصور کرتا تھا لیکن اسے پتہ چل چکا ہے کہ دنیا نہایت عارضی، ناپائیدار اور فانی شئے ہے۔ وہ اسے اس لئے بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا کہ یہ عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ شب و روز یعنی دن رات یعنی ہمیشہ دنیا اپنے اسی مزاج پر قائم رہتی ہے۔ بازیچہ اطفال یعنی کھیل کے ساتھ ''تماشا'' کی ردیف طرز اظہار کی ندرت کا اعلی نمونہ ہے۔

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں .... مسیحا مرے آگے

یہ ایک تلمیحی شعر ہے۔ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اڑنے والے تخت کا ذکر ہے اور دوسرے مصرعے میں حضرت عیسیٰؑ کے اس معجزے کا جس میں وہ قم کہہ کر مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ شاعر کے نزدیک یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ جب انسان اپنے کردار کی معراج پر پہنچتا ہے تو قدرت اسے ایسے معجزوں سے نوازتی ہے۔ شاعر قدرت کے اس رمز کو

جان چکا ہے اسی لئے وہ اورنگ سلیماں کو ایک کھیل اور اعجاز مسیحا کو محض ''اک بات'' قرار دیتا ہے۔

جز نام نہیں .... اشیاء مرے آگے

صورت عالم یعنی دنیا کی صورت۔ یہاں شاعر کہتا ہے کہ اس کے نزدیک دنیا محض ایک نام ہے۔ نام سے زیادہ کی حیثیت اسے منظور نہیں۔ عام فہم انداز میں کہا جائے تو شاعر کے نزدیک یہ دنیا نام کی دنیا ہے اور اس میں موجود اشیاء اس کے لئے محض ایک وہم کا درجہ رکھتی ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ حاصل شعر یہ ہے کہ ذات خداوندی کے سوا شاعر کسی چیز کو موجود نہیں سمجھتا۔

ہوتا ہے نہاں .... دریا مرے آگے

صحرا بہت وسیع اور دشوار گزار ہوتا ہے لیکن میری صحرا نوردی کے آگے وہ گرد میں چھپ جاتا ہے۔ گویا شاعر کہتا ہے کہ صحرا میرے لئے کوئی وحشت ناک شئے نہیں ہے۔ وہ تو میری وحشت کے آگے گرد ہے، دھول ہے۔ دریا کا جبیں خاک پہ گھسنا سامنے کی چیز ہے۔ دریا کے کنارے پر صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کی موجیں زمیں پر سر پٹختی ہیں۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ اس کے ارادوں کی راہ میں نہ صحرا حائل ہوسکتا ہے اور نہ ہی دریا۔ یہاں شاعر اپنی ذات کے حوالے سے دنیاوی مشکلات پہ انسانی حوصلے کی سبقت اور برتری کی بات کر رہا ہے۔

مت پوچھ کہ کیا حال .... تیرا مرے آگے

اے میرے محبوب مجھ سے مت پوچھ کہ تیرے بغیر میری کیا حالت ہوتی ہے۔ میں تیری جدائی میں کس قدر بے چین اور مضطرب رہتا ہوں۔ شاعر کی خواہش یہی ہے کہ اس کا محبوب جدائی میں اس کی کیفیت کی بجائے ملنے پر اپنی حالت پر توجہ مرکوز رکھے۔ یہاں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ملنے پر شاعر کا محبوب کس حالت میں ہے۔ کیا وہ شاعر سے حجاب کر رہا ہے، یا ناراض ہے یا کوئی اور کیفیت ہے۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاعر کی خواہش ہے کہ وہ جس طرح اپنی محبوب کی جدائی میں بے چین و بے قرار رہتا ہے اس کا محبوب ملاقات پر اس کی اس حالت کو محسوس کرے اور اس کا صلہ دے۔

سچ کہتے ہو........................ سیما مرے آگے

شاعر اپنے محبوب کے آگے اعتراف کرتا ہے کہ وہ خود بین اور خود آرا ہے۔ 'نہ کیوں ہو' کہہ کر وہ گویا کہتا ہے کہ یہ میرا حق ہے۔ اور یہ حق اس لئے ہے کہ اس کے آگے اس کا محبوب ایک 'بت آئینہ سیما' کی مانند بیٹھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے آئینے کے آگے انسان خود کو دیکھے گا اور سنوارے گا ہی۔ یعنی یہ کہ شاعر کی اس کیفیت کا ذمہ دار بھی اس کا محبوب ہی ہے۔

پھر دیکھئے انداز .... صہبا مرے آگے

غالب کی شراب نوشی مشہور رہی ہے اور غالب نے اسے کبھی چھپایا نہیں ۔ اس شعر میں وہ اس کا اعتراف کررہے ہیں کہ اگر ان کے آگے پیمانہ وصہبا یعنی شراب کا جام اور شراب رکھ دی جائے تو ان کی طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے اور ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں ۔ یہاں اگر ہم شراب اور جام کی جگہ فکر اور الفاظ کے معنی لیں تو اس شعر کا مفہوم بہت اعلی برآمد ہوتا ہے ۔ یعنی شراب اگر فکر ہو اور الفاظ پیمانے ہوں تو پھر میری گل افشانی گفتار عروج پر ہوتی ہے ۔

نفرت کا گماں .... ان کا مرے آگے

جب کوئی شخص میرے سامنے تیرا نام لیتا ہے تو مجھے اس پر رشک ہوتا ہے ۔ اگر چہ کہ کوئی دوسرا محبوب کا نام لے تو مجھے سخت ناگوار گزرتا ہے ۔ لیکن مجھے مشکل یہ آ پڑی ہے کہ میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرے سامنے محبوب کا نام بھی نہ لے ۔ کیونکہ ایسا کرنے سے سننے والے کو یہ غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے کہ مجھے اپنے محبوب کے نام سے نفرت ہے ۔ لہذا میں ایسے رشک سے توبہ کرتا ہوں جس سے اپنے ہی محبوب سے نفرت کا گمان پیدا ہو ۔

ایماں مجھے روکے .... کلیسا مرے آگے

کلیسا اور کعبہ کے حوالے سے غالب اس شعر میں دنیا میں خیر و شر کے درمیان کشمکش کا نقشہ کھینچتے ہیں ۔ یہاں ایمان اور کعبہ خیر کی علامت ہیں تو کلیسا یعنی گرجا اور کفر شرک کی علامت ہیں ۔ انسان کی زندگی اسی طرح خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان کشاکش سے عبارت ہے ۔ غالب یہاں اعلان کررہے ہیں کہ وہ صاحب ایمان ہیں اس لئے ان کا ایمان انہیں کلیسا یا کفر کی جانب بڑھنے سے روک رہا ہے ۔ لیکن شر کی بھی اپنی طاقت ہوتی ہے ۔ اسی لئے کفر بھی غالب کو اپنی جانب پوری طاقت سے کھینچ رہا ہے ۔ دوسرا مصرعہ طرز ادا کی خوبصورت مثال ہے ۔

عاشق ہوں .... لیلا مرے آگے

فریب دینا تو معشوق کا کام ہے لیکن یہاں غالب اس کے عین برعکس مضمون بیان کررہے ہیں کہ وہ عاشق ہیں اور معشوق کو فریب دے رہے ہیں ۔ معشوق فریبی کی ترکیب یہاں بہت اہم ہے ۔ معشوق کو فریب دینے میں ہمارا شاعر اس قدر کامیاب ہے کہ اس کا معشوق یعنی لیلا اپنے مجنوں جیسے عاشق کو بھی برا بھلا کہتی ہے ۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ اردو غزل کے روایتی عاشق کی امیج کو الٹ کر رکھ دیتے ہیں ۔ ورنہ اس سے پہلے عاشق تو معشوق کے آگے روتا، گڑگڑاتا اور ایڑیاں رگڑتا نظر آتا ہے لیکن غالب وہ عاشق ہے جو اپنے معشوق سے اٹھکلیاں کرتا ہے اور معشوق کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ اس سے بہتر عاشق کوئی اور نہیں ہے ۔

خوش ہوتے ہیں .... تمنا مرے آگے

شاعر ہجر کی رات یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ یوں ہجر میں مرنا کوئی بات نہیں۔ اس طرح ناکام مرنے سے بہتر ہے کہ ایک مرتبہ وصل نصیب ہو اور وصل کی اس گھڑی میں مرجائیں۔ ہجر کے مارے عاشق کی یہی دعا ہوتی ہے کہ بس ایک بار وصل نصیب ہو اور میں خوشی سے مرجاؤں۔ لیکن جب عاشق کو شب وصل نصیب ہوئی تو اس کی کیفیت شادی مرگ کی سی ہوگئی۔ اسی لئے غالب کہتے ہیں انھیں محسوس ہوتا ہے کہ شب ہجر کے دوران کی گئی اس کی تمنا اس کے سامنے آگئی ہے اس شعر میں ایک بہت ہی لطیف خیال کو بے حد دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

گو ہاتھ کو .... مینا مرے آگے

بے شک غالب ایک بلانوش تھے اور انہوں نے اپنی اس بری عادت کو کبھی نہیں چھپایا۔ ایک شرابی کی خواہش تو یہی ہوگی کہ ساغر و مینا ہمیشہ اس کے سامنے رہیں۔ چاہے اس کی جسمانی کیفیت کیسی ہو۔ لیکن اگر یہ تصور کیا جائے کہ یہاں ساغر و مینا زندگی کے استعارے ہیں۔ اس تناظر میں اس شعر کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ شاعر کو زندگی سے عشق ہے۔ اور وہ باوجود ضعف کے زندگی کے سرور کو کشید کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ ہاتھ سے پیالہ اٹھا نہیں سکتا تو کیا ہوا وہ اپنی آنکھوں سے تو اس سرور کا لطف لے سکتا ہے۔

ہم پیشہ وہم مشرب .... اچھا مرے آگے

اس شعر کے مخاطب کا اندازہ نہیں ہو پاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ خود کلامی ہے۔ لیکن اگر یہ خود کلامی بھی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ غالب کا مخاطب ان کا عہد اور ان کا زمانہ ہے۔ غالب کو ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ انہیں ان کے عہد میں سمجھا نہیں گیا۔ اسی لیے وہ اعلان کرتے ہیں کہ غالب ان کا ہم پیشہ، ہم پیالہ، ہم نوالہ اور ہم راز ہے۔ اسی لیے وہ چاہتے ہیں کوئی اسے برا نہ کہے وہ بھی خود غالب کے سامنے۔

4.7 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- مرزا غالب کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کی۔
- مرزا غالب کے معاصرین کی معلومات حاصل کیں۔
- مرزا غالب کے فن کی خصوصیات سے واقف ہوئے۔
- مرزا غالب کے شعری اسلوب کے اہم پہلوؤں سے روشناس ہوئے۔

- مرزا غالب کی ایک غزل کی تشریح کی مدد سے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کیا۔

4.8 اپنا امتحان خود لیجیے

1 - غالب کے چند اہم معاصرین کے نام بتائیے۔

2 - مرزا غالب کے کلام کی تین اہم خصوصیات بتائیے۔

3 - مرزا غالب نے اپنے مقدمہ کے سلسلے میں کہاں کا سفر کیا تھا؟

4 - مرزا غالب نے کن کن اصناف میں شاعری کی؟

5 - مرزا غالب کے والدین اوران کی اہلیہ کا کیا نام تھا؟

4.9 سوالات کے جوابات

1 - غالب کے اہم معاصرین میں (۱) محمد ابراہیم ذوق ، (۲) مومن خاں مومن ، (۳) مفتی صدرالدین آرزدہ، (۴) الطاف حسین حالی، (۵) میر مہدی مجروح۔

2 - مرزا غالب کے کلام کی اہم خصوصیات (۱) جدت ادا۔ (۲) نئے نئے مضامین ۔(۳) شوخی و ظرافت۔

3 - مرزا غالب نے اپنی جائیداد کے مقدمے کے لیے کلکتہ کا سفر کیا تھا۔

4 - غالب نے غزل کے علاوہ قصائد، قطعات اور رباعیات کہیں۔

5- مرزا غالب کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم اور اہلیہ کا نام امراؤ بیگم تھا۔

4.10 فرہنگ

لفظ	معنی
بازیچۂ اطفال	بچوں کے کھیل کا میدان
اورنگ	تخت
نہاں	چھپا ہوا
خودبیں	خود کو دیکھنے والا

خودآرا	خود کو سنوارنے والا
قلزم	سمندر
کلیسا	گرجا
شب ہجراں	جدائی کی رات
بادہ خوار	شرابی
رقیب	مقابل
دشت	جنگل
عشرت	خوشی
خوگر	عادی
شہود	دیکھنا
شاہد	دیکھنے والا
مشہود	جسے دیکھا جائے

4.11 کتب برائے مطالعہ

1۔	عبدالرحمٰن بجنوری	محاسن کلام غالب	انجمن اردو پریس اردو باغ، اورنگ آباد، 1925
2۔	الطاف حسین حالی	یادگار غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 1986
3۔	شمس الرحمٰن فاروقی	تفہیم غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 1989
4۔	ڈاکٹر یوسف حسین خان	اردو غزل	اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد، دکن، 1948
5۔	ڈاکٹر اختر انصار	غزل اور درسِ غزل	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1959
6۔	ڈاکٹر اختر انصاری	غزل کی سرگزشت	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2000
7۔	حسرت موہانی	شرح دیوان غالب	فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2004